国家级教学成果二等奖系列教材

亚非语言文学国家级特色专业建设点系列教材

جدید اردو ادب پارے

乌尔都语现当代文学作品选读

李俊璇◎编著

世界图书出版公司

国家级教学成果二等奖系列教材

亚非语言文学国家级特色专业建设点系列教材

جدید اردو ادب پارے

乌尔都语现当代文学作品选读

李俊璇◎编著

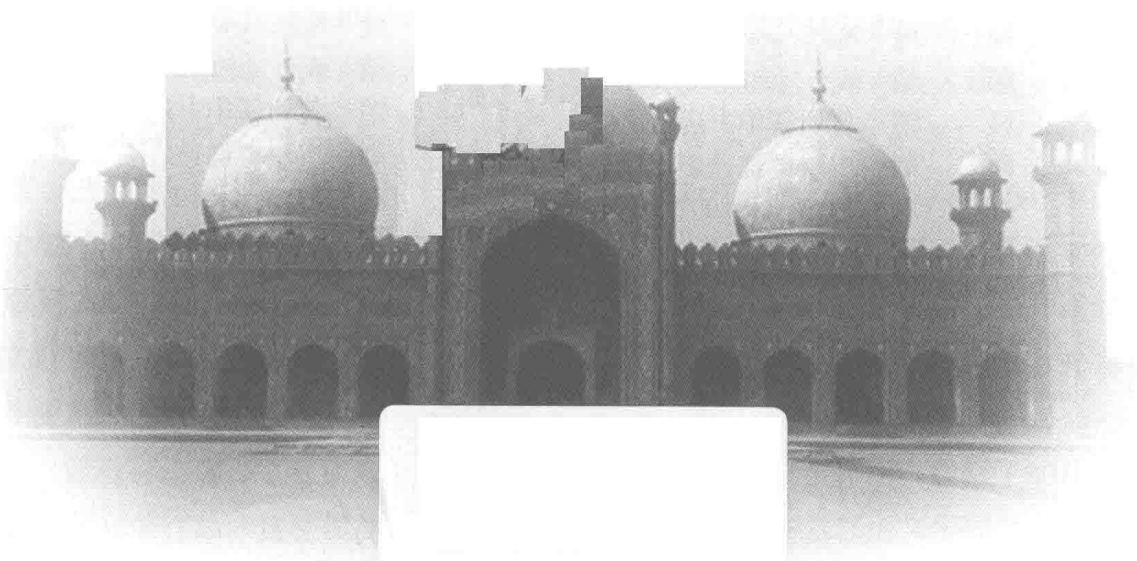

世界图书出版公司

广州·上海·西安·北京

图书在版编目（CIP）数据

乌尔都语现当代文学作品选读 / 李俊璇编著. —广州：世界图书出版广东有限公司，2017.5
ISBN 978-7-5192-3037-1

Ⅰ. ①乌… Ⅱ. ①李… Ⅲ. ①乌尔都语—阅读教学—高等学校—教材 Ⅳ. ①H713.94

中国版本图书馆CIP数据核字（2017）第120789号

书　　名	乌尔都语现当代文学作品选读 WUERDUYU XIANDANGDAI WENXUE ZUOPIN XUANDU
编 著 者	李俊璇
策划编辑	刘正武
责任编辑	张梦婕
装帧设计	余坤泽
出版发行	世界图书出版广东有限公司
地　　址	广州市新港西路大江冲25号
邮　　编	510300
电　　话	020-84451969　84453623　84184026　84459579
网　　址	http://www.gdst.com.cn
邮　　箱	wpc_gdst@163.com
经　　销	各地新华书店
印　　刷	广州市德佳彩色印刷有限公司
开　　本	787mm × 1092mm　1/16
印　　张	20.25
字　　数	380千
版　　次	2017年6月第1版　2017年6月第1次印刷
国际书号	ISBN 978-7-5192-3037-1
定　　价	48.00元

版权所有　侵权必究
（如有印装错误，请与出版社联系）

编者的话

《乌尔都语现当代文学作品选读》为解放军外国语学院亚非语系主任、博士生导师钟智翔教授主持的国家级教学成果二等奖系列教材之一，也是国家外语非通用语种本科人才培养基地暨印度语言文学国家级特色专业建设点建设教材。

本教材是解放军外国语学院乌尔都语专业自2003年建立以来，在使用多年的文学课教材的基础上根据教学需要精心修订而成的。该教材以现当代乌尔都语文学发展及巴基斯坦、印度等国的乌尔都语文学思潮为主线索，选入了富有代表性的26位作家的54篇作品。在体裁的选择上兼顾到了小说、诗歌、戏剧、散文、自传等多种类型，同时也考虑到了文章的语言特点、文字难度、篇幅容量等因素。同时，本教材的编写还兼顾了选文的代表性、诗歌在乌尔都语文学中的重要性以及当代乌尔都语文学发展的趋势性三个方面因素。

《乌尔都语现当代文学作品选读》以乌尔都语现代文学为起点，并考虑到乌尔都语文学发展的脉络性。包括了体现印度独立斗争的进步文学运动作家及作品，反映印巴分治伤痕的现代主义作家及作品，反映巴基斯坦建国初期社会面貌的当代小说，当代著名的幽默散文，反映城镇家庭及乡村生活的象征派小说等。该教材选文体裁的广泛性和选文作品的顺序性都是为了让读者更全面客观地了解现当代乌尔都语文学的丰富面貌及发展情况。

同时该教材对诗歌给予了充分的重视，选择了现当代乌尔都语诗坛上公认的优秀诗人及其作品，包括现代诗歌的奠基人迦利布、伊克巴尔、革命诗人菲兹、最杰出的现代主义诗人法拉兹、女性诗歌第一人阿妲·捷菲丽、女权主义诗人吉什沃尔·娜希德、巴诺贝尔文学奖提名者沃齐尔·阿迦等，以及近年来斩获顶级文学奖的印度诗人贾维德·艾赫德尔及巴基斯坦诗人哈里斯·胡里格等。鉴于诗歌的篇幅，为了让学习者接触更多的诗人及其作品，有的课文采取一课收入两位作家作品的方式，根据其经历的关联度或者作品的联系性选取。目的是有效增加学习者知识量及开阔眼界，并引导学生更好地阅读、比较、分析其作品。

该教材还选入了近年来印巴最具影响力的乌尔都语文学作品，包括了2010年以后的最新获奖作品。这些作品体现着当代印度及巴基斯坦乌尔都语文学界最新动向，有

利于国内学习者了解其文学发展的趋势。

该教材每课内容由导读、原文（节选）、注释、作家介绍及练习五个部分组成。附录部分收入了近现代文学史上部分具有开创性意义的作品，这部分作品是现代小说及诗歌的起点，带有韵文痕迹，稍有难度，可供学有余力者及爱好者阅读学习。

本教材作为乌尔都语专业本科教材，适合本科三、四年级“乌尔都语文学”课程使用，计划课时为72学时。教师在教学中可以根据实际情况进行调整。

《乌尔都语现当代文学作品选读》一书在编选过程中，得到了解放军外国语学院亚非语系教材建设委员会、解放军外国语学院亚非语言文学二级学科博士学位授权点以及中国出版集团世界图书出版广东有限公司的大力支持，钟智翔教授在教材编写过程中给予了多方面指导与支持，在此表示诚挚的谢意。

由于编者水平有限，篇目选择未必适当，有挂一漏万及谬误之处在所难免，恳请学界专家、同仁和广大读者不吝批评指正。

编　者

2017年4月1日

于解放军外国语学院

试读结束：需要全本请在线购买：www.ertongbook.com

فہرست

پہلا سبق امراؤ جان ادا 1

دوسرا سبق انار کلی 16

تیسرا سبق ہمالہ 28

چوتھا سبق دیباچہ برائے بانگ درا 39

پانچواں سبق بڑے آدمی 48

چھٹا سبق کفن 56

ساتواں سبق ملاقات 66

آٹھواں سبق نعرہ 74

نواں سبق وہ لمحہ جو میرا تھا 84

دسواں سبق اوور کوٹ 91

گیارہواں سبق سات ڈرامے : گھر کی رونق 100

بارہواں سبق پریم چند سنگھ 110

تیرہواں سبق آنگن 127

چودہواں سبق پوسٹ مارٹم 150

پندرہواں سبق خدا کی بستی 157

سولہواں سبق دو سفرنامے 173

سترہواں سبق زریں تاج 183

اٹھارہواں سبق ایک استاد عدالت کے کٹہرے میں 200

انیسواں سبق میں ایک میاں ہوں 208

بیسواں سبق میلے میں 221

اکیسواں سبق کھیل تماشا 233

بائیسواں سبق قائم دین 252
تیئیسواں سبق لاوا 266
چوبیسواں سبق نہ قفس نہ آشیانہ 279
ضمیمہ الف باغ و بہار 294
ضمیمہ ب ماہ 310
حوالہ جات 314

پہلا سبق　　امراؤ جان ادا

作品导读

《乌姆拉奥·江·阿妲》的出版轰动印度，被一致公认为是乌尔都语小说史上第一部重要的现实主义作品。该书以 1857 年民族大起义为背景，批判了贵族阶层的奢靡生活和对民族命运的漠不关心，是现代乌尔都语小说史上的重要作品。作家米尔扎·鲁斯瓦原名米尔扎·穆罕默德·哈迪，是印度著名乌尔都语作家。他的小说大多是对现实的深刻批判，他的创作理念是人生而平等，作家都应该“关注他们，了解他们的思想，反映他们的愿望”。

小说描写了勒克瑙一位艺妓乌姆拉奥·江·阿妲的不幸经历。女主人公出身于一个殷实的家庭，天性活泼热情，不幸遭父亲仇人报复而沦落为艺妓。虽然身处风尘，但是她在教养、谈吐及才学方面却颇具才情，在人品和道德方面更是保持着坦率、诚恳和朴实，并渴望着自由平等。她一心想跳出火坑，经过多次努力与尝试。虽然最终离开了妓院，却无法过上正常人的生活，最后孤独终老。节选内容为乌姆拉奥回忆天真无忧的童年时光，以及遭受劫持被卖入妓院的过程。语言简练明快，尤其是对话部分，既与情节贴合，又恰到好处地勾勒出人物性格。在内容上对性格独立、真实率性的女性给予了充分肯定和褒扬。小说中有部分诗歌穿插，同时每一节都以两行诗歌开始作为下文提要。

امراؤ جان ادا

مرزا محمد ہادی رسوا

(۱)

لطف ہے کون سی کہانی میں

آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنئے مرزا رسوا صاحب! آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزا ہے۔ جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد

نامراد آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگ خاندان، عار دو جہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔

اچھا سنئے اور اچھی طرح سنئے:

باپ داد کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھوپڑے کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بہشتی کچھ نائی۔ دھوبی، کہار، میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا۔ کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی۔ اور مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لئے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے۔ اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھئے۔ میں کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابا ابا کر کے دوڑا، دامن سے چمٹ گیا ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکار، پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بھیا کو گود میں اٹھا لیا۔ پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کٹارے ہاتھ میں ہیں۔ کبھی بتاشوں اور تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کٹار اچھینے لئے جاتا ہے۔ میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں ادھر میرے تقاضے شروع ہوگئے۔ "ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ لو ابھی تک میرا طوق سنار کے ہاں سے بن کے نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے۔ بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو۔ عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی، ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ جب اماں کھانا پکا چکیں۔ مجھے آواز دی۔ میں گئی روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دستر خوان بچھا اماں نے کھانا نکالا سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ ابا نے عشاء کی نماز پڑھی، سو رہے۔ صبح کو تڑکے ابا اٹھے۔ نماز پڑھی اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی۔ پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

"میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا......"

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ ایک دو ہوائیں اڑاتے تھے اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں۔ کیونکہ ابا پہر دن چڑھے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینے پرونے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے کہیں محلے میں نکل گئی۔ یا دروازہ پر املی کا درخت تھا۔ وہاں چلی گئی۔ ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے بھیا کو بٹھا دیا۔ خود کھیل میں مصروف ہوگئی۔ ہائے کیا دن تھے۔ کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی۔ کیونکہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں جہاں میں رہتی تھی۔ وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا۔ اور سب ایک کھپریل میں رہتے تھے میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا۔ دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پر ایک کھپریل دو کوٹھریاں کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں، چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بہشتی پانی بھرتا تھا۔ محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے تو لوگ انہیں

جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں۔ ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا۔ مگر ایسی بھی نہ تھی۔ جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی۔

ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ سوتواں نہ تھی۔ مگر پچی اور پھیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گل بدن کا پائینچامہ سجامہ چھوٹے چھوٹے پ لہچوں کا ٹول کا نیفہ، نینو کی کرتی، تنزیب کی اوڑھنی ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کیساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کار خانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا۔ مگر بہت وسیع، دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں، گھی، دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ادکھ کے ڈھیر لگے ہوئے۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولہا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا۔ بلکہ ساتھ کھیل تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے۔ کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں۔ میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دولہا کی صورت کریمن (ایک دھینے کی لڑکی کا نام تھا) جو میرے دوست تھی کہ دولہا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے۔ میرا دولہا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولہا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے میرے دالہا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔

غرضکہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی۔ کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔ مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چندا ڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا۔ موا چاندی کا تھا شاید ایک آنہ سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ یہ اب کہتی ہوں اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے لئے اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انہوں نے مجھے چمکارا۔ اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت

چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کیلئے میں نے بہت مار کھائی۔ مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہائی محبت تھی۔ اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا۔ مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا۔ گود میں اٹھا لیا۔ پیار کر لیا جب دیکھا اماں آتی ہیں جلدی سے اتار دیا۔ اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا۔ لگیں گھرکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا۔ مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں۔ راتوں کی نیند حرام۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں۔ کسی سے تعویذ مانگتی ہیں۔

میرے جہیز کے لئے اپنے گلے کا گنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ "اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جھنجنے بنے ہوئے ہیں ان کو اجلوا دو۔" گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لئے۔ باقی نکال کے الگ کر دیئے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا اوہ جی ہو گا۔ تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں۔ وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں۔ سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوادگی کی جوش وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا۔ جو کچھ نہ کریں کم ہے۔ کیوں نکہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے۔ مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کر خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ پس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کمبخت اودماتی تھی۔ شادی ہونے میں دیر ہوئی۔ کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی اس نے چھوڑ دیا۔ کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی۔ آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقع اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں۔ ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا نہ صورت شکل دیکھی۔ نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں یا جوانی میں سر پر آسمان ٹوٹا رانڈ ہو گئیں۔ صبر نہ ہو سکا دوسرا کر لیا۔ یا صحبت ملی آوارہ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت واتفاق نے مجبور کر ایسے جنگل میں چھوڑا۔ جہاں سوائے گمراہی کوئی راستہ نہ تھا۔

دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ موا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنو میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلے سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لئے لوگ طلب ہوئے۔ ان میں ابا بھی تھے۔ آہ بیچارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ رانی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے

试读结束：需要全本请在线购买： www.ertongbook.com

کے پوچھا۔ "دل جمعدار! تم سچ مچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مار لینے گئے، نہ دیا۔ ابا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے۔ جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں کیوں نکلی تھی۔ دیکھی کیا ہوں۔ املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے کہنے لگا۔ "چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دے گئے تھے۔ کبوتر لے لو۔" میں اس کے دام میں آ گئی۔ ساتھ چلی گئی۔ جا کے دیکھتی ہوں۔ گھر میں کانی چڑیا نہیں۔ اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں مکان میں داخل ہوئی۔ ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دیا۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیئے۔ اس کان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا۔ مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا۔ وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا کہ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا کوئی بس نہیں۔ موذی کے چنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بھلی کے اندر مجھے گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موئے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاروں طرف اندھرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے۔ سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا۔ آنکھوں سے باراں جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا ہے ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہو گا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، بھائی، مکان کا دالان، انگنائی، باورچی خانہ، سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہو گی۔ گودڑ اب میرے منہ میں نہ تھا۔ مگر مارے ڈر کے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا ادھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں: "دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کا پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا..... تلملاتا پھرتا ہو گا۔"

پیر بخش: بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمہیں قید ہوئے۔

دلاور خاں: پورے بارہ برس ہوئے بھائی۔ لکھنو میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خیر وہ بھی تو کوئی دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش: کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں: تم سمجھتے کیا ہو۔ جان سے مارا تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش: بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو۔

دلاور خاں: دیکھنا

پیر بخش: اور اسے کیا کرو گے؟

دلاور خاں: کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں ٹوپ دو۔ راتو رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے دل میں ایک دھچکا سا لگا۔ منکا ڈھل گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دئے۔ یہ حال دیکھ کر بھی

م وئے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ میں گر پڑوں۔

پیر بخش : اسے تو مار ڈالوگے اور ہمارا روپیہ ؟

دلاور خاں :گلے گلے پانی

پیر بخش : کہاں سے دوگے ؟ ہم کچھ اور ہی سمجھے تھے۔

دلاور خاں : گھر چلو۔ کہیں نہ سے ہوسکے گا تو کبوتر بیچ کے دے دوں گا۔

پیر بخش : تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو۔ ہم نہ ایک بات بتائیں۔

دلاور خاں : کہو!

پیر بخش : اماں لکھنو میں چل کے اسی چھوکری کو ڑے کر لو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔

پیر بخش کی باتیں سن کر میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کہتا ہے۔

دلاور خاں : اچھا دیکھا جائے گا۔ ابھی چلے چلو۔،

پیر بخش : یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں۔ وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے۔ تھوڑی دیر آگ لے آئیں تو حقہ بھر لیں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ اکبارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرامزادی چپ نہیں رہتی۔ ابھی چھری بھونک دوں گا... فیل کرتی ہے..."

پیر بخش : (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہو گا) نہیں بھئی ایسا کام نہ کرنا تمہیں ہمارے سر کی قسم اماں ہمیں تو آلینے دو۔

دلاور خاں : اچھا جاؤ آگ تو لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں : (ایک کش حقہ کا پی کے) تو یہ کتنے بک جائے گی؟ اویچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش : اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں، بکڑے گا کون؟ لکھنو میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو۔"

دلاور خاں : کریم!

پیر بخش : ہاں۔ اس کی روٹی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا لکھنو میں جا کے دام کھرے کر لئے۔

دلاور خاں : آج کل کہاں ہے ؟

پیر بخش : کہاں ہے؟ لکھنو میں گومتی اس پار اس کی سسرال ہے وہیں ہوگا۔

دلاور خاں : بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش : جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں : بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی۔

پیر بخش : سو ڈیڑھ سو۔ جیسی تمہاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں : بھائی کی باتیں۔ سو ڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی تو بہت ہے۔

پیر بخش : اچھا اس سے کیا۔ لے تو چلو۔ مار ڈالنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا۔ جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے خواب دیا۔"وہ تو ہم سمجھے ہی تھے۔ تم کیا ایسے بیوقوف ہو۔

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ طاقت سلب ہوگئی تھی۔ بدن سن ہوگیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بلیوں کا کمل اڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی۔ مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر سے کملی سرکا کے جو دیکھا معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا سامنے کچھ کچے مکان ہیں۔ ایک بنئے کی دکان ہے دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آکے تھوڑی سے بھنے ہوئے چنے دئے میں رات بھر کی بھوکی تھی۔ کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا میں نے تھوڑا سا پیا۔ پھر چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رکی رہی۔ پیر بخش نے بیل جوتے۔ دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آبیٹھا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی چھری نکلی۔ نہ مجھ پر گھونسے پڑے نہ گھرکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے۔ کچھ گانے لگے۔ ایک گانا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے سن کیا رہا ہے سوچ رہا ہے۔ کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہونے لگی۔ آستینیں چڑھ گئیں۔ کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک گاڑی پر سے کود پڑتا ہے۔ دوسرا وہیں گلا گھوٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑگئے۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ پھر ملاپ ہوا۔ دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک : ہمارے تمہارے لڑائی کی ہی کیا بات تھی۔

دوسرا : بات ہی کیا تھی۔

پہلا : اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو

دوسرا : جانے دو۔

(۲)

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد

شب اول ہے گرفتاری کی

گرفتاری کی شب اول کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے! دنیا میں تو خیر اپنی سزا کو پہنچا۔ مگر کیا اس سے میرے دل کو تسکیں ہوئی۔ موئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کے چیل کوؤں کو کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے اور قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیسے تیری جان کو کلپتے ہوں گے۔

بس مرزا صاحب! اتنی آج کہی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ اڈا چلا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوف چیخیں مار مار کے روؤں...

آپ میری آوارگی کی سرگزشت سن کے کیا کیجئے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجئے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبہ نہ لگتا یہ دین و دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے اپنی ماں کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔ کب اس کو دیکھا تھا۔ اس کو ایک زمانہ ہوا۔

اب خدا جانے جیتی ہیں یا مر گئیں سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ چودہ پندرہ برس کا۔ دو لڑکیاں ہیں۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔ موئے ایک روپے میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنو چار دن کا رستہ تھا۔ مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے نہ معلوم کن بیہڑا راستوں سے لایا کوئی آٹھ دن میں لکھنو پہنچی۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنو کہاں ہے۔ مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی۔ کہ یہ لوگ مجھے وہیں لئے جاتے ہیں۔ لکھنو کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی۔ کیونکہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا ہی رہتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے۔ میرے لئے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے۔ میں انہیں اچھی طرح پہنچانتی تھی۔

لکھنو میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لا کر اتارا۔ چھوٹا سا مکان کریم کی ساس موئی مردے شونی سی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے گھر میں لے گئی ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ صبح ہوتے لکھنو پہنچی تھی۔ دوپہر تک بند رہی۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چمچہ بھر ماش کی دال اور بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہوگئی۔ آٹھ دن ہوگئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی۔ اس کیبعد زمین پر پاؤں پھیلا کر سو رہی۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی کیونکہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز نہ ہو سکتی تھی اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی۔ چاروں طرف اندھیرا کوئی آس پاس۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی۔ پھر نیند آگئی۔ تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھلی تو پھر نیند نہ آئی۔ پڑی جاگتی رہی۔ اتنے میں کریم کی ساس ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ بیٹھی۔

"لونڈیا کتنی سوتی ہے۔ رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ کے اٹھایا۔ سانس ہی نہ لی۔ میں تو سمجھی سانپ سونگھ گیا۔ اے لو وہ تو اٹھ بیٹھی۔"

میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک چکی تو پوچھنے لگی...

"پیالہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھا دیا۔ وہ باہر لے کر نکلی۔ کوٹھری کا دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی اسے کھول دیا۔ مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آ کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی اسی کوٹھری میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کے لے آیا تھا۔ بیچاری کیسی چھکو پھکو روتی تھی۔ مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے چپکے باتیں ہوا کیں۔

کسی بنئے کی لڑکی تھی۔ رام دیئی نام تھا۔ سیتا پور کے پاس کوئی گاؤں تھا۔ وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا۔ میں نے اسے دیکھا گوری گوری تھی۔ بہت گوری گوری تھی۔ بہت خوبصورت ناک نقشہ، ڈیل ذرا چھریرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی۔ پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دوپہر دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خاں اور پیر بخش نے آ کے مجھے نکالا اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان۔ پھر ایک بازار میں سے ہو کر گزری۔ پھر ایک پل پر آئے۔ دریا لہریں مار رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپی جا رہی تھی۔ اور تھوڑی دور کے بعد ایک بازار پھر ملا۔ اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں دور تک چلنا پڑا۔ پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے۔ یہاں بڑی بھیڑ تھی۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازے پر پہنچی۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کونسا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا۔ جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی یعنی چوک، اور یہ وہ مکان تھا جہاں سے ذلت عزت، بدنامی نیک نامی، زردروئی، سرخروئی جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا۔ یعنی خانم جان کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینہ پر سے چڑھ کر اوپر گئی۔

مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دلان کے داہنی طرف ایک دلان وسیع میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم کو آپ نے دیکھا ہو گا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا۔ مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ململ کا دوپٹہ کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید اودے مشروع کا پائجامہ بڑے بڑے پائچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کانوں میں سادی دو انتیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھیں بسم اللہ کی رنگت ناک نقشہ ہو بہو انہی کا سا تھا۔ مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔

کنول روشن ہے، بڑا سا نقشی پاندان آگے کھلا ہوا رکھا ہے۔ پیچوان پی رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے میں چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

خانم جان: یہی چھوکری ہے؟

دلاور: جی ہاں

مجھے پاس بلایا، چمکار کے بٹھایا۔ ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی

خانم جان: اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے۔ اور دوسری چھوکری کیا ہوئی۔

پیر بخش : اس کا تو معاملہ ہو گیا

خانم :کتنے میں؟

پیر بخش : دو سو پر

خانم : اچھا خیر۔ کہاں ہوا؟

پیر بخش : ایک بیگم نے اپنے صاحبزادے کے واسطے مول لیا ہے۔

خانم : صورت شکل اچھی ہے اس قدر ہم بھی دے نکلتے مگر تم نے جلدی کی۔

پیر بخش : میں کیا کروں۔ میں نے تو بہت سمجھایا میرے سالے نے نہ مانا۔

دلاور خاں : صورت تو اس کی اچھی ہے۔ آگے آپ کی پسند

خانم : خیر آدمی کا بچہ ہے۔

دلاور خاں : اچھا جو کچھ ہے آپ سامنے حاضر ہے۔

خانم : اچھا تمہاری مہی ضد سہی۔

یہ کہہ کر حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت سامنے آکھڑی ہوئی۔

خانم : حسینی!

حسینی : خانم صاحب

خانم : ضد وقچہ لاؤ۔

حسینی گئی۔ ضد وقچہ لے آئی۔ خانم صاحب نے ضد وقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دئے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے دئے تھے۔

اس میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں بندھے (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں مردے نے اپنے ڈب میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اب کمرے میں خانم صاحب ہیں اور بوا حسینی اور میں ہوں۔

خانم صاحب : (حسینی سے) حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی۔

حسینی : مہنگی! میں کہتی ہوں سستی۔

خانم : سستی بھی نہیں ہے۔ خیر ہو گا۔ صورت تو بھولی بھالی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہو گا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔

بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا۔ آخر یہاں نہ بکتی کہیں اور بکتی۔

حسینی : خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں۔ نیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں۔

试读结束：需要全本请在线购买： www.ertongbook.com